

تنزیل و تاویل

امثال قرآن

(۳)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جبراجپوری

آیات زیر بحث کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے :

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّكَجَلْدَيْنِ أَحَدُهُمَا
 أَنْبَكُمْ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَى مَوَاكِهِ
 أَيْتَمَّ يَوْمَهُ لَكَيَاتٍ يَخِيرُ هَلْ يَسْتَوِي
 هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ
 مُسْتَقِيمٍ

سیدھے راستے پر ہے۔

اور اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ان میں
 سے ایک گونگا ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا ،
 اپنے مالک پر ایک بار ہے ، اسے جہاں کہیں بھی بھیجتا ہے
 کوئی فائدہ حاصل کر کے نہیں لوٹتا ، کیا ایسا شخص اس
 شخص کے برابر ہے جو عدل و قسط کا حکم دیتا ہے اور

اس آیت میں اللہ اور غیر اللہ یعنی معبود حقیقی اور معبودان باطل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ معبودان
 باطل کی مثال تو اس گونگے آدمی کی سی ہے جو قوت عقل اور گویائی دونوں سے یکسر محروم ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے
 کہ جودل اور زبان دونوں کا گونگا ہو، اور پھر اس کے عجز و ناتوانی کا حال یہ ہو کہ کوئی کام بھی کرنے کی قدرت
 اس میں نہ ہو، خواہگی و آقائی کرنا تو درکنہ زلم و ظلم و بندگی اور غلامی کرنے میں بھی اتنا گھٹیا ہو کہ اس کا آقا اس سے
 کوئی بھلا کام نہ لے سکے۔ ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی مثال اس شخص کی سی ہے جو حکمراں اور نیکو فرما ہو۔

معبودان باطل بے حیات ہیں۔ عاجز و درماندہ ہیں۔ بندگی میں بھی گھٹیا درجہ پر ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ نہ صرف ذی حیات ہے بلکہ منبع حیات ہے، عاجز نہیں بلکہ توانا و قادر مطلق ہے، گونگا نہیں بلکہ متکلم ہے، عدل کا حکم دیتا ہے اور خود بھی راو عدل (مراوہ مستقیم) پر ہے۔ اور یہ اوصاف اس کے اندر پورے کمال اور پوری شانِ محمودیت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کا عدل یعنی حق کے مطابق حکم دینا خود اس امر کا مقتضی ہے کہ وہ حق اور عدل کی حقیقت بدرجہ اتم اپنے اندر رکھتا ہے اور اسی کی اپنے بندوں کو تلقین کرتا ہے۔ اس کو پسند کرتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ اُس کے مرکز سے ہٹ کر کبھی کسی بات کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کے خلاف اوصاف یعنی ظلم و جور اور سفاہت و بطالت وغیرہ نقائص سے بالکل پاک منزہ ہے، اور جو حکم بھی دیتا ہے وہ سراپا عدل ہی ہوتا ہے۔ اسکی امر بالعدل (عدل کا حکم دینا) دونوں طرح کے امر کو شامل ہے، یعنی امر شرعی اور امر نیکوینی۔ یہ دونوں کے دونوں عدل محض کا پرتو ہیں جن میں جور کا شائبہ تک نہیں۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے فخر ہو کر فرمایا کرتے تھے:

اللهم انی عبدک ابن عبدک	خدا یا! میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا
ابن امتک ناصیتی بیدک ما حین	بیٹا، تیری کنیز کا بچہ۔ میری پیشانی تیرے ہاتھ
فی حکمک عدل فی قضاءک	میں ہے۔ میرے حق میں تیرا حکم نافذ ہے۔ میرے
.....	معاملہ میں تیرا فیصلہ ہم حال حق بجانب ہے۔

یہاں دو فقہاء سے مراد وہی امر نیکوینی ہے، کیونکہ اس کے ”امر“ کی یہ شان ہے کہ جب کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو عرف اتنا فرماتا ہے کہ وہ جوہر“ اور بس وہ ہو جاتی ہے۔

قَالَ مَا أَمَرْتُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَعَلَّيْ كُنْ فَيَكُونُ۔

لہذا اس کا حکم اور اس حکم سے متعلق قضاء و قدر سب عین حق اور عدل ہیں۔

امر بالعدل کی صفت بیان کرنے کے بعد اپنی دوسری صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کی ہے کہ

وہ ”سیدھی راہ پر ہے“ (إِنَّهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ) حضرت شعیبؑ کا یہ قول بھی اسی حقیقت کا حامل ہے۔

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ
سَأَتِي وَرَبُّكُمْ مِمَّا مِنْ دَاثِرٍ
إِلَّا هُوَ اخِذْ بِنَاصِيَتِهِ إِنَّ رَبِّي
عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے جو میرا اور تمہارا
سب کا پروردگار ہے۔ ہر چھپنے والے جاندار کی
پیشانی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ بیشک میرا پروردگار
سیدھی راہ پر ہے۔

حضرت شعیبؑ کے الفاظ ”مَا مِنْ دَاثِرٍ إِلَّا هُوَ اخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ“ اور ”مختصر معلوم
کے الفاظ ”ناصیتی بیدار“ دونوں میں ایک ہی روح ہے۔ اسی طرح ”إِنِّي تَوَكَّلْتُ
عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“ اور ”عدل فی قضاہ“ بھی ایک ہی حقیقت کی دو
مختلف تعبیریں ہیں۔ پہلی صفت کو ”ملک“ اور دوسری کو ”معد کہتے ہیں، وہو سبحانہ
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَمْدُ

”خاص سیدھے راستہ پر ہے“ اس جملہ کی گہرائیوں میں اترو اور دیکھو کہ اس کی تہ میں جہاں الہی کے کلمے
انوار پوشیدہ ہیں۔ سیدھے راستہ پر ہونے کا اقتضا یہ ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، حق فرماتا ہے۔ جب حکم دیتا ہے صل
ہی کا حکم دیتا ہے۔ جو کچھ کرتا ہے مصلحت، حکمت، رحمت اور عدل کے حدود سے باہر ہو کر نہیں کرتا۔ مختصر یہ
کہ قتل اور فعل دونوں لحاظ سے حق پر ہے۔ پس ناممکن ہے کہ اپنے کسی بندے پر ایک مرتد کو ظلم کا فیصلہ کرے، یا
بغیر کسی گناہ کے اسے سزا دے، یا اس کی نیکیوں میں سے دبر دستی کچھ کم کر دے، یا دوسرے کے گناہ کا پوچھ
خواہ مخواہ اس پر ڈال دے جنہیں نہ تو اس نے برا اور راست خود کیا ہو نہ ان کے لیے کسی حیثیت سے ذریعہ
بنا ہو۔ غرضیکہ وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے لیے ضرورتاً کا باعث نہ ہو اور اچھے اور مفید انجام
اور حکیمانہ مقاصد پر مشتمل نہ ہو۔ کیونکہ اس کا صراط مستقیم پر ہونا ان تمام باتوں کی نفی کرتا ہے۔

محمد ابن جریر طبری اس جملہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

”ہمارا پروردگار طریق حق پر ہے۔ اپنے نیک اور حسن بندے کو اس کی نیکی اور احسان کا بدلہ دیتا ہے اور برے کو اس کی برائی کا۔ کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا اور نہ کسی سے اسلام و ایمان کے سوا کسی شے کو قبول کرتا ہے۔“

اس کے بعد امام مہار کا قول نقل کرتے ہیں کہ مراد مستقیم سے مراد مراد حق ہے۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ جملہ آیت ”إِنَّ رَبَّكَ لَبَاقٍ فَصَادٍ“ ”بیک تیرا رب گناہیں لگا ہوا

کا ہم معنی ہے۔ مگر یہ اختلاف محض لفظی ہے۔ ورنہ اس جماعت کے خیال کا حاصل بھی وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ خدا کے گناہات میں رہنے کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ وہ برے کو برا اور اچھے کو اچھا بدلہ دے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جملہ میں حزن ہے اور اس کی تفسیر یوں ہے ”إِنَّ رَبَّكَ

يَحْكُمُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ وَيُحْضِرُكَ عَلَىٰ“ یعنی میرا پروردگار تمہیں مراد مستقیم پر چلنے کی ترغیب

دیتا ہے۔ اگر ان لوگوں کی اس حزن و تقدیر سے مراد یہ ہے کہ آیت کا مقصود بالذات مفہوم ہی ہے

تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس مقدر پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں جسے وہ پیش کر سکیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انک

انگ دو صفتیں بیان کی ہیں، ایک امر بالعدل کی، دوسری مراد مستقیم پر ہونے کی۔ امر بالعدل کے مفہوم

و معنی میں وہ بات تو آئی گئی جسے یہ لوگ ”إِنَّ رَبَّكَ لَبَاقٍ فَصَادٍ“ کے متعلق فرماتے

ہیں۔ پھر دوسرے ٹکڑے کے کھنڈ کی کیا ضرورت تھی؟ ہاں اگر ان کا مقصد اس مقدر کے ماننے سے

یہ ہے کہ خدا کا مراد مستقیم پر بذات خود ہونا اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بھی اس کے لیے

ترغیب دیتا ہے تو ان کا خیال صحیح ہے۔

ایک جماعت اس جملہ کی تفسیر کرتی ہے کہ ”تمام امور اور ساری مخلوق کو خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا

ہے، کوئی شے اس سے بچ کر نہیں نکل سکتی، سو یہاں بھی ہم وہی بات کہنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ جماعت اپنے اس قول کو آیت کا منصوبہ معنی سمجھتی ہے تو برسرِ غلط ہے، ہاں اگر اسے اس آیت کے لوازم اور موجب میں سے شمار کرے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

تفسیروں میں اس آیت کی ایک اور تاویل دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ ”ہر چیز خدا کے قبضہ قدرت اور ملک میں ہے“۔ بھائے خود یہ بات خواہ کتنی ہی حق بھی لیکن جس آیت کی تفسیر میں وہ پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں۔ اس بات کے کچھ والوں نے شاید غور نہیں کیا کہ حضرت شعیبؑ نے اپنے قول میں دو جملے فرمائے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے ”مَا مِنْ ذَا بَلْتَةٍ إِلَّا هُوَ لَاحِظٌ بِهَا“ فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد ”إِنْ رَکَّتْ عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ“ یہ دونوں جملے الگ الگ ہیں اور دونوں اپنے اپنے مستقل معانی رکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلا جملہ خدا کی قدرت کی بے گبری ظاہر کر چکا تھا۔ پھر اس جملہ میں اسی بات کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

انفرض امام مجاہد کا قول صحیح ہے اور یہی اکثر ائمہ تفسیر کا خیال ہے۔ ابی حاتم سے اس کا دوسرا مطلب ٹھیکرانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر غور کرو تو معنوی اعتبار سے بھی یہ خیال نہایت بلند اور پاکیزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”وہ جسے چاہتا ہے (یعنی جسکے بارے میں اسکی حکمت مقتضی ہوتی ہے) گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر لے آتا ہے“۔ پس اگر خدا ہی وہ ذات ہے جس نے انبیاء اور ان کے اتباع کو قولا و عملا صراطِ مستقیم پر قائم کیا ہے تو وہ اس امر کا اور دنیا و دہستحق ہے کہ اپنے قول اور عمل کے اعتبار سے صراطِ مستقیم پر ہو۔ اور اگر ہدایت یا بے ہدایتوں کی مراد مستقیم اپنے رب کے احکام کی موافقت کا نام ہے تو خدا کی صراطِ مستقیم نام ہوگا اس کے اس قول حق یا غفل حق کا جو اس کی شانِ حمد اور شانِ کمال کا مقتضا ہے۔

اب اصل تمثیل کے مضمون کی طرف آئیے۔ اس تمثیل میں بھی پہلی مثال کی طرح ایک دوسرا قول ارباب تفسیر نے نقل کیا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ یہ مثال کا فرادوسرے کی ہے۔ لیکن چونکہ پہلی تمثیل پر بحث کرتے

ہوئے ہم نے اس خیال کی توجیہ کر دی ہے اس لیے دوبارہ اس سے تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) کلام باری تعالیٰ سے اور اس میں تدبیر کرنے سے اعراض کرنے والوں کی مثال:

فَمَا لَهُمْ مَعَ اللَّهِ كَيْفَ مُخْرَجِينَ
كَانَ هُوَ حُجْرًا مُسْتَنْفَرًا فَتَاتَ مِنْ
قَسَوَاتِهِ
ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نصیحت (یعنی قرآن) سے
ہوں بدکتے ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر سے ڈر
کر بھاگتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور بلیغ تشبیہ ہے۔ قرآن سے بھاگتے ہی وہ لوگ ہیں جو اسکی حقیقت سے
بالکل نااہل ہوتے ہیں۔ ان کی ہیئت نفسی ان جنگلی گدھوں کی کیفیت باطنی سے بالکل مشابہ ہوتی ہے جو
کسی بات کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اور جب کسی چیز کی آہٹ پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ شیر ہی ہوگا، لہذا سر پر
پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ قرآن سے بھاگنے والے بھی اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ
کوئی پھاڑ کھانے والی چیز ہے حالانکہ یہ حشرِ خیر و سعادت اور منبع حیات ہے۔ پھر راز زندگی کو پیام
موت سمجھنے والا گدھا نہ ہوا تو اور کیا ہوا؟

”مستنفر“ کے لفظ میں جو بلاغت ہے وہ ”نافع“ کے لفظ سے ہرگز نہ پیدا ہو سکتی۔ نافرہ
کے معنی موت بھاگنے والے کے ہیں۔ لیکن مستنفر کے لفظ میں بھاگنے اور بھاگنے، دونوں کا مفہوم
شامل ہے جو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ فرار کی شدت اتنی بے پناہ تھی کہ گویا ایک فرار دوسرے کیلئے بھاگنے
کا باعث ہوا اور ایک نے دوسرے کو بھاگنے پر ابھارا۔ یہ لطف ”نافرہ“ کہنے میں پیدا نہ ہو سکتا تھا۔
ایک قرأت ”مستنفر“ کی بھی ہے یعنی فت کو مفتوح پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں
یہ لفظ اسم فاعل ہونے کے بجائے اسم مفعول ہوگا اور معنی یہ ہونگے کہ شیعہ کے خوف نے ان گدھوں
کو بھاگنے پر برا بیگھنے کیا۔

(۱۱) غیبت کی مثال:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا احْذَرُوا الْفِتَنَ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا
وَلَا يَغْتَبِ بََعْضُكُم مِّبْصَرَ بَعْضٍ أَيْحِبُّ أَحَدُكُمْ
أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ
كَنُوبٌ حَسِيمٌ (المحجرات - ۲)

اے ایمان والو بہت قیاس آرائیاں کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ گمان و قیاس گناہ بھی ہو جاتا لوگوں کے حال کا تجسس نہ کیا کرو۔ اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کیا کرو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے اور لوگ اس سے گھبن کھائے لگیں؟ اللہ سے ڈرو بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

کسی مسلمان کے پردہ ناموس کو ٹھٹھ کر کے کرنے کی تشبیہ اس کے گوشت کو پارہ پارہ کرنے سے دینا قیاس تشبیہ کی کیسی بے نظیر مثال ہے۔ چونکہ غیبت کرنے والا اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر اس وقت حمل کرتا ہے جب وہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا اس لیے اس کا حال بالکل اس شخص کا ہے جو کسی کی طرح غائب ہو جائے (یعنی مر جائے) کے بعد اس کے جسم سے گوشت نوجیتا ہو۔ اور چونکہ وہ غریب اپنی اس غیبت سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور اپنی مرافعت بھی نہیں کر سکتا اس لیے وہ بمنزل اس بے جان لاش کے ہے جسکی ہڈیاں کافی جا رہی ہوں اور وہ اپنے کو بچانے کی قدرت نہ رکھتی ہو۔ نیز چونکہ غیبت کنندہ دوسرے کی متاع عزت سے متنع ہوتا ہے اور اس کی مذمت سے اپنے نفس کی پیاس بجھاتا ہے اس لیے اس کی تشبیہ گوشت کھانے والے کے ساتھ دی جو مردہ بھائی کی ہڈیاں چبا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہو۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ اس بزرگوئی کو پسند بھی کرتا ہے اس کی تشبیہ اس شخص کے ساتھ دی گئی جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند بھی کرتا ہو۔ اے نبیؐ احذر کے الفاظ اس جرم کو اور دہاوت سخت بنا دیتے ہیں۔ کراہت کے ساتھ مردہ کا گوشت کھانے سے بدتر درجہ یہ ہے کہ رغبت کے ساتھ کھایا

جائے۔ اور ظاہر ہے کہ غیبت کرنے والا آدمی اس غیبت سے لذت بھی لیتا ہے۔

گہری نظر سے اس تشبیہ کے موقع محل اور اس کے محاسن پر غور کرو، معقول (مثبت) اور محسوس (مثبتہ پر) میں کیسا کامل تطابق ہے۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ انداز بیان کیسا دلنشین اور موثر ہے۔ بجائی کا گوشت فوج فوج کو کھانا طبعاً ہر شخص کو کھانا و نا معلوم ہوتا ہے۔ اور تمام مخاطبین کے اندر اس فطری احساس کراہیت کا موجود ہونا یقینی ہے۔ لہذا پہلے تو خدا نے اس احساس کے وجود کی خود خبر دی پھر آیت کے آخر میں تمام مخاطبین کو اس وصف سے متصف قرار دیا (فَكَرِهْتُمُوهُ) نیز اس سے قبل آیت کے شروع میں استفہام انکاری کے ذریعہ اس حقیقت کی مزید توثیق کر دی (أَيَحِبُّ أَحَدُكُمْ) اس طرح ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے اس فطری احساس کو دماغ میں تحفہ کرنے کے بعد ان پر اس امر کو واضح کیا کہ جب یہ شے تمہاری طبیعت کو کھانا و فی معلوم ہوتی ہے تو پھر کس طرح وہ شے تمہیں مرغوب خاطر ہو سکتی ہے جو اسی کے مشابہ ہے؟ گویا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ایک ناپسندیدہ شے سے اُس شے کے خلاف حجت قائم کی جو انہیں مرغوب ہے۔ پھر شے مرغوب کو اس شے نامرغوب کے ساتھ تشبیہی جس سے انہیں کامل نفرت اور نہ کم ہونے والی کراہیت ہے۔ پس عقل، نفرت اور حکمت عام کا تقاضا ہے کہ وہ اس شے سے بھی ویسی ہی نفرت اور کراہیت رکھیں جیسی اُس کی نفیر اور مسائل سے رکھتے ہیں۔

(۱۲) اعمال کفار کی بے حقیقتی کی تشبیہ:

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَسْتَكْبِرُونَ
أَعْمَالُهُمْ كَمَادٍ سُتَدَّتْ
بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ
حَتَّىٰ كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ
الْبَعِيدُ (ابراہیم - ۳)

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے لو کے دن تیز ہوا اڑا لے جائے۔ وہ اپنے کیے ہوئے اعمال میں سے کسی عمل کا ثواب حاصل کرنے پر نفاور نہ ہونگے۔ یہ ہے پرے درجہ کی ناکامی۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے کفار کے باطل اور فتنانِ اعمال کو ایسی راکھ سے تشبیہ دی ہے جس پر تیز و تند ہوا کا گزر ہو۔ یعنی چونکہ ان اعمال کی نہ تو ایمان کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی، نہ خدا کے لیے وہ کیے گئے تھے اور نہ ہی خدا کے حکم کے مطابق تھے، اس لیے خدا کے حضور میں بالکل ہی بے وزن اور بے حقیقت ٹھہریں گے، اتنے بے وزن کہ خدا نے ان کو اس راکھ کے مشابہ قرار دیا جسے بادِ مرید و مر سے اڑھرا ڈالے جائے اور کوئی شخص اسے کام میں لاسنے پر قادر نہ ہو اور انھیں ایک وہ اس شدید حاجت مند بھی ہو۔ چنانچہ نذرِ الٰہی ہے کہ ”الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهَوْنَ“، یعنی جن اعمال سے وہ فلاح کی اتنی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں قیامت کے دن ان سے اپنی امیدیں اور ضرورتیں پوری کرنے پر مطلق قادر نہ ہونگے اور وہ اعمال ان کے لیے کسی فائدہ اور ثواب کے موجب ہرگز نہ بنیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو صرف انہیں اعمال کو شرف قبول بخشے گا جو اسی کے لیے اور اسی کی نازل کی ہوئی شرع کے موافق ہوں۔ اور ان لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ ان کے کیسے اعمال میں خلوص اور اطاعت الٰہی کا ایک حصہ بھی نہ ہوگا۔

راکھ کے ساتھ ایسے غیر مقبول اعمال کی تشبیہ دینے میں ایک بہایت لطیف نکتہ مضمر ہے۔ راکھ کے مادہ کو کون سی چیز ناسل کر کے راکھ بناتی ہے؟ آگ۔ اور ان اعمال کو کون سی چیز بے اصل اور بے وزن بنائے گی؟ وہ بھی آگ ہی ہوگی۔ کیونکہ جو اعمال ایمان، اللہ اور اطاعت الٰہی کی روح سے خالی ہوں گے وہ دوزخ کی آگ کی خوراک بنیں گے۔ مکتبہ المہین ان باطل اعمال ہی سے ان کے لیے آگ اور عذاب پیدا کریگا، جس طرح کہ وہ اپنے غلصے پر ستاروں اور فرمانبرداروں کے اعمال ہی سے ان کے لیے لذت اور نعمت پیدا کریگا۔ پھر آگ ان اعمال کو جلا کر خاکستر بنا دے گی اور انجام کار یہ منکرین حتیٰ ان کے اعمال اور ان کے سارے موجود آگ کے زندہ من ہو جائیں گے۔

(باقی)